ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

فکر اسلامی کو درپیش جدیدیت کے چیلنج اور مدارس اسلامیہ

(۲؍ مئی ۲۰۲۴ء کو جامعہ ہمدرد میں مدارس اسلامیہ اور عصر حاضر کے مطالبات پر منعقد ہونے والے سیمینار کے لیے لکھا گیا)

موجودہ زمانے کا غالب طرز فکر جدیدیت یا ماڈرنیٹی ہے، جس کا غلغلہ مغرب و مشرق ہر جگہ ہے اور جس کی یلغار سے مذہب، ثقافت اور تعلیم کچھ بھی محفوظ نہیں ہے۔ جدیدیت نے جو چیلنج پیدا کیے ہیں، وہ متعدد ہیں، ان کی جہتیں اور نوعیتیں مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر خدا، مذہب، شریعت، اخلاقی اقدار اور ان کے معیارات، سب اس کے چیلنجوں کی زد میں ہیں۔

مدارس اسلامیہ جو اسلام کے قلعے سمجھے جاتے ہیں، مفروضہ یہ ہے کہ یہاں سے اسلام کے محققین پیدا ہوتے ہیں اور اسلام کی شرح و ترجمانی کا حق ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ وہ قرآن و سنت سے براہ راست واقف ہوتے ہیں، وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ کیا مدارس اسلامیہ جدیدیت کے چیلنجوں سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں؟ کیا وہاں کے اساتذہ اور طلبہ کو جدیدیت سے آشنا کیا جاتا ہے؟ اور کیا وہ اس کے چیلنجوں کا جواب دینے کی پوزیشن میں ہیں؟ اگر نہیں تو اس کے لیے کون سے اقدامات کی ضرورت ہے؟ اس مقالہ میں ان سوالوں اور ان سے متعلقہ مباحث کا جائزہ لیا جائے گا۔

جدیدیت کیا ہے؟

''ویکیپیڈیا'' کے مطابق جدیدیت کی تعریف یہ ہے:

''جدیدیت، ہیومینٹیز اور سوشل سائنسز کا ایک موضوع ہے، یہ ایک تاریخی دور بھی ہے اور خاص سماجی و ثقافتی اصولوں، رویوں اور طریقوں کا مجموعہ بھی، جو ۱۷ویں صدی کی نئی سوچ اور عقلیت کے دور میں اور ۱۸ویں صدی کی روشن خیالی کے زمانے میں، یعنی نشاۃ ثانیہ کے بعد پیدا ہوا تھا۔''[1]

آپ کبھی 'جدیدیت' کا لفظ بولیں تو جدید لباس، نئے آلات و وسائل، بڑی بڑی عمارتیں اور روایت سے ہٹ کر نئے تصورات ذہن میں آتے ہیں، جب کہ مسلمان معاشروں میں جدیدیت سے مراد ماڈرن لباس سے لے کر فلک بوس عمارتیں، سیکولر و مذہب بے زار خیالات، بلکہ بے حیائی و الحاد تک سب کو لے لیا جاتا ہے۔ جدیدیت کے محسوس مظاہر، نئے نئے فیشن اور زیادہ سے زیادہ کی ہوس، یعنی مادیت پرستی کو بجا طور پر اسلامی لٹریچر میں تنقید کا نشانہ بھی خوب بنایا جاتا ہے، مگر اس سے متعلق اصولی بحث خال خال ہی ملتی ہے۔

سولھویں صدی کے اوائل میں یورپ کے لوگوں نے ایک مختلف تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی، جس کے لیے ان کو سائنسی مطالعات اور ٹیکنالوجی کے لیے ترجمہ کے ذریعے سے یورپی زبانوں میں منتقل ہونے والے اسلامی و عربی منابع (کتب، علوم و ایجادات) سے بہت مدد ملی تھی۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں وقوع پذیر ہونے والے اس سائنسی انقلاب نے ثابت کیا کہ کائنات میں ہونے والے تمام واقعات کی وضاحت چند سائنسی قوانین کے ذریعے سے ممکن ہے۔ اس حقیقت کے ادراک نے کائنات کے بارے میں انسان کے تصورات کو یک دم تبدیل کر دیا۔ اس سائنسی انقلاب کے نتیجے میں کائنات ایک مشین کی طرح محسوس ہونے لگی، جس میں ہونے والا ہر واقعہ ایک دوسرے سے مربوط ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو:

"Modernity, a topic in the humanities and social sciences, is both a historical period and the ensemble of particular socio-cultural norms, attitudes and practices that arose in the wake of the Renaissance—in the Age of Reason of 17th-century thought and the 18th-century Enlightenment."

نیز حسن عسکری: جدیدیت یا مغربی گم راہیوں کا خاکہ، مشمولہ مجموعہ حسن عسکری انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔

اِس تہذیب کی بنیاد ماضی کی زرعی معیشت کے بجاے مشینوں، کلوں، نئے علوم اور نئی ٹیکنیکس اور سرمایہ و ٹیکنالوجی پر تھی۔ اِس تہذیب نے جو ایک عمومی مغربی رویہ پیدا کیا، سادہ لفظوں میں وہی ماڈرنیٹی اور جدیدیت ہے، جو اب پوری دنیا کا غالب طرز فکر ہے۔ اور اب صرف یورپ و امریکا تک محدود نہیں، ساری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ ہاں، فی زمانہ اس طرز فکر کا سب سے بڑا علم بردار امریکا ہے۔

جدید ٹیکنالوجی نے نہ صرف انسانوں کے سوچنے کے طریقے بدلے، ان کے ذہن و مزاج بدل دیے، بلکہ سائنس کے غلط استعمال سے آلودگی پیدا کی اور نظام فطرت کو چیلنج کیا۔ جدید انسان جینیٹک تبدیلیاں پہلے حیوانوں میں اور اب انسانوں میں پیدا کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔

جدیدیت کے چیلنج

جدیدیت ایک نظریہ بھی ہے اور ایک رویہ بھی۔ اِس کے پیدا کردہ چیلنجوں میں سرفہرست ڈاروینی ارتقا کے ذریعے سے خدا کے وجود کو چیلنج کرنا ہے، جس کے مطابق یہ کائنات آپ سے آپ کچھ نیچرل قوانین کے تحت نیچرل کیمیکلز کے تعامل سے پیدا ہو گئی اور اس میں زندگی کا وجود بھی خود بخود ہوا۔ لہٰذا دین و شریعت اور اخلاق اس کے نزدیک سب اضافی قرار پائے۔ جدیدیت کے علم برداروں نے ڈاروینی ارتقا کو اصل مان کر پوری انسانی تاریخ کی اسی کے مطابق توجیہ کی ہے۔ موجودہ دور کے ایک مقبول عام مصنف یوال نواحراری نے اپنی کتابوں میں خاص طور پر خدا، مذہب اور تہذیب، سب کو مائنس کر کے انسانوں کی تاریخ لکھی ہے۔[۲] حراری خاص طور پر مذاہب کی ابراہیمی روایت کے خلاف ہے۔ اُس کا استدلال ہے کہ ابراہیمی مذاہب دوسرے عقائد و مذاہب کے تئیں رواداری نقطۂ نظر نہیں رکھتے، بلکہ اپنے سچے ہونے پر اصرار کرتے ہیں، لہٰذا دنیا میں بین المذاہب ہم آہنگی اِن کے ذریعے سے ممکن نہیں ہے۔ اِسی نکتہ کو ہندوستان کے سیکولر و نان سیکولر ہر دو قسم کے ہندو دانش ور اپنی گفتگوؤں اور تحریروں میں شد و مد سے دہراتے رہتے ہیں۔ حراری نے اِس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ ابراہیمی مذاہب کے برخلاف مشرکانہ مذاہب دوسرے مذاہب و افکار کے تئیں زیادہ فراخ دل ہوتے ہیں۔ اِس خیال کو ہندو دانش وروں میں خوب پذیرائی ملی ہے۔ اپنی کتاب ''Homo Sapian'' میں وہ کہتا ہے:

"The insight of Polytheism is conducive to far-reaching

۲۔ یوال نواحراری اسرائیلی یخچر لسٹ مؤرخ اور ماہر مستقبلیات ہے۔ اس کی تین کتابیں مشہور ہیں:
"Homo Sapian", "Homo Deus" and "21 Lessons for 21 century".

religious tolerance."(P: 239)[۳]

۱۔ جدید کاسمولوجی، جو سائنس و ٹیکنالوجی نے تشکیل دی ہے، اس نے مذہب کے روایتی موقف پر جو سوال کھڑے کر دیے ہیں، ان پر غور و فکر کرتے ہوئے پہلا اصولی مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ آج ارسطو کا وہ ورلڈ ویو جو سترہ صدیوں تک دنیا پر چھایا رہا، مسترد ہو چکا ہے۔ اس ورلڈ ویو میں زمین کائنات کا مرکز تھی، وہ ساکن تھی، سورج اس کے گرد چکر لگاتا تھا (پرانی ادبیات میں اسی لیے آسمان کو گردوں کہتے تھے)، کائنات ارضی کا مرکز توجہ، مخدوم اور امین انسان تھا۔ بعض لوگ اس کو خلافت ارضی سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اس ورلڈ ویو میں اسلام کے حامی اور مخالف، دونوں ایک ہی پیج پر تھے، مگر اب وہ افسانۂ پارینہ ہے۔

آج جو ورلڈ ویو دنیا کو رول کر رہا ہے، وہ گلیلیو، ڈیکارتے، نیوٹن، ہبل اور آئن اسٹائن وغیرہ کے سائنسی نظریات اور تحقیقات پر مبنی ہے۔ سائنسی انقلاب نے یہ سوچ پیدا کی کہ کائنات قوانین فطرت کے تحت چل رہی ہے، جن میں خدا بھی دخل نہیں دے سکتا۔ اس انقلاب نے خدا کے تصور کو ختم تو نہیں کیا، لیکن اب کائنات کے ارتقا کو سمجھنے میں خدا کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب یہ تصور کیا جا سکتا تھا کہ اس کائنات کے نظام کو سمجھنے میں خدا کی ضرورت نہیں، ظاہر ہے کہ یہ راستہ الحاد کی طرف جاتا ہے۔

اس ورلڈ ویو کے مطابق زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، سورج اور دوسرے ستارے و سیارے اپنے اپنے محور پر گردش میں ہیں۔ انسان کو کوئی خاص پوزیشن، (مثلاً اسلامی ادبیات میں خلیفہ فی الارض اور اشرف المخلوقات ہونا) اس زمین پر حاصل نہیں۔ بلینوں کہکشانوں پر محیط اس کائنات میں خود زمین ایک نقطہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ارتقا اور اب بگ ہسٹری کے تصورات نے مذہب کے نظریۂ تخلیق اور انسان کی خصوصیت و اشرفیت کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ اس میں انسان کو 'An Animal of no significance' کہا جاتا ہے جو کہ حراری کی کتاب "Homo Sapian" کا پہلا باب ہے۔ بگ بینگ یا نیچرل ارتقا پر مبنی یہ تاریخ بتاتی ہے کہ نہ اس کائنات کا کوئی مقصد ہے اور نہ انسان کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے۔ یہ کائنات و مافیہا سب نیچر کے

۳۔ حالاں کہ یہ یُوال نواحراری اور اس کے مقلد دانش وروں کی بے بصیرتی ہے۔

وہ اپنے بیانات میں اِس بات کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں کہ ہندو مذہب نے اپنے احیائی عہد میں دوسرے مذاہب، خاص طور پر بودھ مت کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا کہ اس کے نشانات تک مٹا کر رکھ دیے۔ ایک ہندو راجہ پشپامترا نے ۸۰ ہزار سے زائد بودھ استوپا (معابد) کو تباہ کر دیا تھا۔

اندھے قوانین کے تحت وجود میں آئی اور انھی قوانین کے تحت اپنے آپ بے مقصد ختم بھی ہو جائے گی۔ ایسے میں خدا کا وجود، حشر نشر، آخرت وغیرہ کے تصورات سب غیر سائنٹیفک تصورات قرار پاتے ہیں۔

۲۔ مذہب انسان کی جو تاریخ اور کہانی بتاتا ہے، وہ پانچ چھ ہزار سال سے پیچھے نہیں جاتی، جب کہ بگ بینگ اور نیچرل ارتقا پر مبنی تاریخ عظیم بتاتی ہے کہ کائنات کی عمر قریباً تیرہ ارب سال ہے۔ اس کے مطابق ہماری زمین سات ارب سال پہلے بنی اور اس پر زندگی کا وجود پانی میں تقریباً چار ارب سال پہلے ہوا۔ زندگی نے مختلف ارتقائی منازل سے گزر کر بلینوں سال پہلے حیوانی قالب اختیار کیا۔ ارلی انسان اور نینڈر تھیل وجود میں آئے، لاکھوں سال کے گزرنے اور نیچرل سلیکشن سے گزرتے ہوئے وہ ہنٹنگ گیدرنگ کے مرحلہ میں پہنچا۔ ایک لاکھ نوے ہزار سال ہنٹنگ اور گیدرنگ کے مرحلہ میں رہنے کے بعد وہ آئس ایج اور اس کے بعد حجری زمانہ سے گزر کر زراعت کے دور میں داخل ہوا اور ایک متمدن معاشرہ کی بنیاد پڑی۔ یہ مرحلہ بھی ختم ہوا اور زراعت کے بعد موجودہ صنعتی معاشرہ وجود میں آیا۔[۴]

تاریخ عظیم کی یہ کہانی بتاتی ہے کہ بایولوجی کے اعتبار سے مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مختلف معاشروں میں ہم جو فرق ان دونوں میں دیکھتے آئے ہیں، وہ اصل میں کلچرل موثرات کی وجہ سے ہے، اس کی کوئی حقیقی وجہ نہیں۔ ''Homo Sapian'' کے مصنف کا کہنا ہے کہ ''انسانی سماج میں مرد کے وظائف، عورت کے وظائف اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انسانی جسم کے مختلف اعضا کے بامقصد وظائف کا تصور ان نیچرل ہے۔ وہ اصل میں مسیحی تھیولوجی سے آیا ہے، ورنہ بایولوجیکلی کسی چیز کا کوئی مقصد اور ہدف نہیں ہوتا۔ مرد قوام ہے اور عورت گھر کی ملکہ ہے وغیرہ تصورات اصل میں انسانی Imagination کے ساختہ ہیں''۔[۵] وہ کہتے ہیں کہ انسان بنیادی طور پر چیزوں کو imagine کرتا ہے۔ چنانچہ یہ انسانی کلچر، ثقافت و تہذیب، مذہب و روحانیت، اخلاقی احساس وغیرہ، یہ سب اس کی imagination کا نتیجہ ہیں اور ایک myth ہیں، ورنہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔[۶] یہ کاسمولوجی کہتی ہے کہ تاریخ blindly سفر کرتی ہے اور اس کائنات اور اس پر زندگی کا کوئی مقصد نہیں، ایک دن یہ یونہی Blindly ختم بھی ہو جائے گی۔ ناظرین دیکھ رہے ہیں کہ یہ جو بیانیہ ہے یہ اپنے اندر مذہب، وجود باری تعالیٰ وغیرہ کے کتنے بڑے چیلنج رکھتا ہے اور ہماری اس فتنہ سے مقابلہ کی تیاری کیسی

۴۔ ڈاکٹر محمد عطریف شہباز ندوی، کائنات کا آغاز وارتقاء، ماہنامہ اشراق المورد لاہور، جنوری/فروری ۲۰۲۱ء۔

۵۔ ملاحظہ ہو: An imagined order ص ۱۱۴۔

۶۔ ایضاً صفحہ ۱۲۳۔

ہونی چاہیے، یہ کسی پر مخفی نہیں۔

۳۔ تیسرا مسئلہ مغربی سائنس و ٹیکنالوجی کا پیدا کردہ یہ ہے کہ آج جینیٹک انجینئرنگ کے ذریعے سے، یعنی انسانی جینوم کو کنٹرول کرنے کے پروگراموں کے ذریعے سے یہ کوشش کی جارہی ہے کہ اپنے من پسند انسان پیدا کیے جاسکیں۔ کلوننگ کا عمل جو شروع میں ڈولی نامی بھیڑ پر کیا گیا اور اس کا ہم زاد پیدا کیا گیا تھا، اب بات اس سے بہت آگے بڑھ چکی ہے اور پیڑ پودوں، سبزیوں اور اناجوں سے گزر کر اب حریم انسانی اس کی زد میں آیا چاہتا ہے۔

جاپان میں مردوں کی آخری رسومات ایک روبوٹ انجام دے رہا ہے، جرمنی میں چرچ کے اندر ایک روبوٹ پادری کلیسائی مذہبی فرائض انجام دے رہا ہے۔ AI یعنی آرٹیفیشل انٹیلی جنس[۷] کے ذریعے سے روبوٹ اب محض مشینی آلات نہ رہ کر انسانی ذہن و شعور کے حامل بھی ہوں گے اور وہ دن دور نہیں جب ہمارے امام و مؤذن روبوٹ ہوا کریں گے۔ دنیا میں مصنوعی ذہانت کا چرچا ہے، جس سے بڑے بڑے کام لیے جارہے ہیں اور یہ ہر یونیورسٹی میں پڑھائی جارہی ہے۔ ترجمہ کے میدان میں مصنوعی ذہانت کا استعمال ہو رہا ہے۔ کبھی فلموں میں اور فکشن میں روبوٹک بیویوں کی بات آیا کرتی تھی، مگر اب تو وہ سچائی بن کر انسانوں کے سامنے آنے والی ہے۔ سفاک اسرائیل فلسطینیوں کے قتل عام کے لیے AI کا استعمال خوب کر رہا ہے۔ تو سوال دینیات اور اہل مدارس کے سامنے یہ ہوگا کہ روایتی معاشرتی احکام اِن نئے قسم کے اور انوکھی نوعیت کے انسانوں پر کس طرح لاگو ہوں گے؟ کیا وہ سرے سے شریعت کے مخاطب بھی رہ جائیں گے یا نہیں؟ یا ان کے لیے کوئی اور ہی فقہ ڈویلپ کی جائے گی؟

۴۔ جدیدیت نے ایک بڑا چیلنج سائنٹزم کا پیدا کیا، جس میں سائنس کو اٹھا کر مذہب کی جگہ دے دی گئی۔ انیسویں صدی میں اِس طرز کا بول بالا رہا۔ بیسویں صدی میں اِس پر خود مغرب میں بھی شدید تنقیدیں ہوئیں۔ تاہم ڈاکٹر محمد اجمل کہتے ہیں کہ:

> ”بیسویں صدی میں فلسفۂ مادیت سے بے زاری تو پیدا ہوئی، لیکن اس کا تدارک اس طرح نہیں کیا گیا کہ لوگ اصل دین کی طرف لوٹیں، بلکہ اِس طرح کہ نت نئے خداؤں کی صنعت فروغ پا گئی۔ ایسے ایسے فلسفے تعمیر

۷۔ مصنوعی ذہانت کی سادہ تفہیم کے لیے دیکھیے: مصنوعی ذہانت اور تعلیمی ترقی، ڈاکٹر محمدی شیخ، تہذیب الاخلاق، اپریل ۲۰۲۴ء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کیے گئے جو بظاہر مذہبی معلوم ہوتے تھے، لیکن تحقیق کرنے پر ان کی بنیاد بھی مادیت ہی نکلتی تھی۔ برگساں ہو یا ولیم جیمز، ونگسٹائن ہو یا آئن اسٹائن سب کے سب در حقیقت مادیت کے پرستار تھے، لیکن انھوں نے نقاب روحانیت یا مذہب کے اوڑھ رکھے تھے۔''[۸]

ٹیکنالوجی کی نئی نئی ترقیوں نے اِس طرز فکر کو دنیا بھر میں غالب کر رکھا ہے۔ سائنٹزم کا دعویٰ ہے کہ سائنس کے پاس انسان کے ہر مسئلہ کا حل ہے، یہاں تک کہ موت کا حل بھی ڈھونڈنے کی کوشش جاری ہے۔ سائنس دان ایسے منصوبوں پر کام کر رہے ہیں جن میں موت پر قابو پالیا جائے گا یا کم از کم انسان کی عمر کا دورانیہ مخصوص ڈرگز کے ذریعے سے ناقابل یقین حد تک بڑھالیا جائے گا۔ اب کاریں، فریج وغیرہ آنکھوں کے اشاروں پر کام کریں گی۔ اس کے علاوہ انسان کے جسم پر ڈرگز کی حکمرانی ہو گی۔ جینوم پراجیکٹ کے ذریعے سے مخصوص جین لے کر خاص قسم کے مطلوبہ انسان پیدا کرنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ انسان فطری غذا پر زندگی نہیں گزارے گا، بلکہ اب مصنوعی غذائیں Artificial food اور Synthetic food کا عادی ہو گا۔

۵۔ انسانی زندگی میں مختلف جذبات کی بڑی اہمیت ہے اور بہت سے دینی احکام بھی انھی جذبات، مثلاً محبت و الفت، رحم و مہربانی، نفرت و کراہیت، غصہ و حسد وغیرہ کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں۔ انسانی تہذیب ان کی بنیاد پر ترقی کرتی ہے، سماجی رشتے ان سے بنتے بگڑتے ہیں۔ اب ڈرگز اور دواؤں کے ذریعے سے ان کے جذبات کو ختم کرنے، ان کو کنٹرول کرنے یا ان کو بدل دینے کی بات کی جا رہی ہے۔[۹] حتیٰ کہ ایک بڑا پراجیکٹ انسانی جین پر تحقیق کے ذریعے سے اس امکان کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے کہ موت کا خاتمہ انسان کی زندگی سے کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یا انسان کی زندگی کا دورانیہ بڑھا دیا جائے اور وہ ہمیشہ جوان رہے، اُسے کوئی مرض لاحق نہ ہو وغیرہ۔[۱۰] اگر ایسا کسی بھی درجہ میں ہو جاتا ہے تو اس سے روایتی فقہی احکام پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا ان چیزوں

۸۔ مجموعۂ حسن عسکری، ص ۱۱۷۷، پیش لفظ۔

۹۔ ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی، نئی کاسمولوجی کا چیلنج، ماہنامہ اشراق ہند اکتوبر ۲۰۱۹ء المورد فاؤنڈیشن الہند۔

۱۰۔ جینوم پراجیکٹ کے لیے دیکھیے ویکیپیڈیا:

"Genome projects are scientific endeavours that ultimately aim to determine the complete genome sequence of an organism and to annotate protein-coding genes and other important genome-encoded features. The genome sequence of an organism includes the collective

کو تغییر خلق اللہ کی قبیل سے سمجھا جائے گا یا نہیں؟

ہمارے علما گذشتہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے تصویر کے مسئلہ سے الجھے ہوئے ہیں کہ آیا فوٹو میں کسی شے کی حقیقت خود آجاتی ہے یا اس کا عکس آتا ہے؟ تصویر اگر سرکٹی ہو تو جائز ہو گی یا نہیں؟ ڈیجیٹل کیمرے سے لیے گئے فوٹو پر حدیث میں آئی وعید کا اطلاق ہو گا یا نہیں وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ اب سائنس و ٹیکنالوجی جس دنیا کو سامنے لا رہے ہیں، اس میں ہمارے یہ فقہی قواعد وضوابط کچھ کام دیں گے؟ فی الحال کیتھولک چرچ کی مخالفت کی وجہ سے اور کچھ اور اسباب سے بعض ملکوں میں سائنس کو کچھ پابند کیا گیا ہے اور اس کی تحقیقات پر کچھ قدغنیں عائد کی گئی ہیں، مگر تا کے؟ جب یہ جن بوتل سے باہر آئے گا تو نطشے نے تو God is dead کہہ دیا تھا، مستقبل قریب کا انسان فرعون کی زبان میں کہے گا کہ ''میں پیدا کرتا ہوں اور مارتا ہوں، اس لیے میں ہی خدا ہوں''۔ یعنی سائنس دان ہی 'أنا ربکم الأعلیٰ' کا نعرہ مارے گا۔ حراری نے مستقبل قریب کے اِسی انسان کو Homo Deus (دیوتا انسان) سے تعبیر کیا ہے۔

یہ ہیں نئی کاسمولوجی کے وہ پہلو جو ارتقا اور نیچرل ہسٹری کی بنیاد پر مذہب کے بالمقابل کائنات کے آغاز وارتقا اور زندگی کی تخلیق کا نیا بیانیہ ہمارے سامنے لا رہا ہے۔ یہ اپنے اندر مذہب کے لیے کتنے خطرے لیے ہوئے ہے، ہماری معروضات سے یہ بات کسی حد تک سامنے آجاتی ہے۔ اب اہل مذہب اور اہل مدارس کو سوچنا یہ ہے کہ اس خطرے سے مقابلہ کی کیا تیاری ان کے پاس ہے؟ وہ اپنے طلبہ کو ان چیلنجوں کے بارے میں بتا رہے ہیں یا نہیں؟ بظاہر تو جواب نفی میں ہی ہے۔

۶۔ ٹیکنالوجی کی یہ حیرت انگیز ترقیاں ایسی ہیں کہ اِن کے سہارے اب سائنس پرست مذہب کا بطلان ثابت کر رہے ہیں۔ غرض جدیدیت یا ماڈرنیٹی نے جو چیلنج پیدا کیے ہیں، وہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں اور ان کی حشر سامانیوں کا سامنا اہل مذہب نہیں کر پا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج الحاد دور جدید کا نیا مذہب بن چکا ہے۔ یہ درست ہے کہ ساری دنیا میں مذہب و روحانیت کی طرف لوگوں کا دوبارہ رجحان بڑھا ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ آج دنیا میں جتنے بڑے پیمانہ پر لامذہب، لاادری، اور ملحدین موجود ہیں، پہلے کبھی نہ تھے۔ آج کے الحاد کے پاس سائنس و ٹیکنالوجی اور نئی کاسمولوجی کے پیدا کردہ سوالات و اشکالات ہیں۔ وہ Reason اور

DNA sequences of each chromosome in the organism."

استدلال سے لیس ہے۔[11] جس کا جواب دینے اور مقابلہ کرنے کے لیے مذہبی تنظیموں، علما اور اہل مدارس کو ماڈرنیٹی اور اس کے چیلنجوں کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے۔ آج جگہ جگہ ایکس مسلم (مرتدین) نظر آرہے ہیں، جو اپنے یوٹیوب چینلوں اور ویب سائٹوں کے ذریعے سے دین و مذہب، خصوصاً اسلام پر حملہ آور ہیں اور ان کے دلائل بھی زیادہ تر وہی ہیں جو دہریے اور لامذہب استعمال کرتے ہیں۔ جن میں ابن وراق اور ایان ہرسی علی کی تحریریں بہت زہر آلود ہوتی ہیں۔

مدارس اسلامیہ اور جدیدیت

موجودہ مدارس اسلامیہ کا نصاب کم و بیش دو صدیوں پرانا ہے۔ اس پورے عرصے میں دنیا میں فکر و عمل کی سطح پر بڑی تبدیلیاں آئیں، بڑے بڑے انقلابات انسانوں کے فکر، طرز زندگی اور عمل میں آئے، مگر مدارس نے شروع سے ہی اپنی کھڑکیاں بند کرلی تھیں، اس لیے ان کو ان میں سے کسی چیز کی بھی ہوا نہیں لگ سکی۔ ایک آدھ استثنا کے ساتھ مدارس اسلامیہ آج بھی کم و بیش اسی رویہ پر قائم ہیں۔

علماے کرام اور اہل مدارس میں جدیدیت کو سمجھنے، اس کے چیلنج کو جاننے اور اس سے مکالمہ کرنے (engage) کرنے کی خواہش عموماً نہیں پائی گئی۔ علما کی صفوں میں اُس کے بعض مظاہر کو سمجھنے اور ان کے جواب کو کافی سمجھ لیا گیا۔ اور ایسے علما کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے جنھوں نے سائنس اور ماڈرنیٹی کو سنجیدگی سے لیا ہے۔ مثلاً سرسید احمد خان، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا شہاب الدین ندوی، عبد الباری ندوی اور مولانا وحید الدین خاں وغیرہ۔ جدیدیت کے سیاسی مظاہر و عمرانی تصورات پر مولانا مودودی نے زبردست تنقیدیں کی ہیں اور اس کے سائنسی کلامی پہلوؤں کا مطالعہ اور ان کا جواب مولانا وحید الدین خاں نے دیا ہے۔[12]

ماڈرنیٹی، جدیدیت یا مغربی فکر کے ردو قبول کے سلسلہ میں مسلمان اہل فکر میں تین طرح کے موقف سامنے آئے:

۱۱۔ ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی، جدید الحاد کا چیلنج، ماہنامہ رفیق منزل، اکتوبر ۲۰۱۸ء اور رچرڈ ڈاکنز کی ویڈیو زیوٹیوب پر https://www.youtube.com/watch?v=bdvoe0j4Hjw

۱۲۔ ملاحظہ ہو: مولانا وحید الدین خاں، علم جدید کا چیلنج، مذہب اور سائنس، اسلام دور جدید کا خالق، عقلیات اسلام، کتاب معرفت اور کتاب حکمت وغیرہ۔

۱۔ مغربی فکر کو جوں کا توں قبول کرنا یہ سرسید اور ان کے رفقا کی رائے تھی اور بدقسمتی سے مغربی فکر کے بہت سطحی و سرسری مطالعہ و مشاہدہ پر مبنی تھی۔

۲۔ اس فکر کو قطعی طور پر مسترد کرنا یہ روایتی علما کا نقطۂ نظر تھا۔

۳۔ تیسرا موقف 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کے اصول پر مبنی تھا اور یہ کم و بیش تمام اسلامی احیائی تحریکوں نے اپنایا اور بتدریج روایتی نقطۂ نظر بھی اسی کی طرف مائل ہوتا چلا گیا۔

مگر مدارس کے نصابات کو عموماً اس سے دور ہی رکھا گیا ہے۔ اور آج بھی کم و بیش یہی فضا برقرار ہے۔ جو مدارس اپنے نصاب اور نصاب تعلیم میں بہت ماڈرن، روشن خیال اور متحرک سمجھے جاتے ہیں، ان کے نصابات بھی جدیدیت کے بعض سطحی مظاہر کو چھو کر گزر جاتے ہیں، مثلاً ان میں معاشیات، نفسیات اور سیاسیات کا کچھ نہ کچھ تعارف کرا دیا جاتا ہے اور تھوڑی سی انگریزی پڑھا دی جاتی ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ مدرسہ ڈسکورسز پروگرام نے، البتہ اِس سے خاصا اعتنا کیا تھا اور منتخب فضلاے مدارس کو اسلامی کلامی روایت کے پہلو بہ پہلو جدیدیت اور اس کے چیلنجوں سے متعارف کرانے کی کوشش کی تھی۔[۱۳]

جدیدیت پر اردو میں اسلامی نقطۂ نظر سے کچھ خاص نہیں لکھا گیا، البتہ اردو کے بڑے ادیب و ناقد حسن عسکری نے (جن کا مغربی ادب انگریزی اور فرنچ کا گہرا مطالعہ تھا) ایک تعارفی کتاب ''جدیدیت یا مغربی گم راہیوں کا ایک خاکہ'' کے نام سے طلبۂ مدارس کے لیے لکھی تھی۔[۱۴]

۱۳۔ مدرسہ ڈسکورسز انڈیا ۲۰۱۶ء-۱۹ء تعارفی کتابچہ پس منظر اور اہداف، Contending Modernities N.D. EDU۔

Keugh School of Global Affaires University of Notre Dame۔ یہ پروگرام پروفیسر ابراہیم موسیٰ نے شروع کیا تھا جو بیک وقت مشرقی و مغربی علوم کے جامع ممتاز اسکالر ہیں اور نوٹرے ڈیم یونیورسٹی (امریکا) میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔ اپنی ایکٹیو صورت میں تو یہ پروگرام فی الحال معطل ہے، البتہ محاضرات کے ذریعے سے اس کا تسلسل باقی رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس لنک پر جائیں:

https://madrasadiscourses.org/

۱۴۔ مجموعۂ حسن عسکری، ص ۱۱۷۸۔ عسکری اپنے مذہبی اور تنقیدی، دونوں ہی خیالات میں انتہا پسند تھے۔ اس کے بعد ان سے متاثر ایک مکتب روایت پاکستان میں وجود میں آیا ہے، جس میں ناقد سلیم احمد اور ان کے شاگرد احمد جاوید،

یہ کتاب اصلاً ایک فرنچ مسلم کنورٹ رینے گینوں (عبدالواحد یحییٰ) کے مغرب پر ناقدانہ خیالات کی تلخیص تھی، اور دارالعلوم کراچی کو اس کو اپنے نصاب میں شامل کرنا تھا، مگر وہ کی نہیں گئی۔ یہ کتاب راقم کے مطالعہ میں آئی ہے۔ اس میں دو کمیاں ہیں: ایک تو حوالوں سے معریٰ ہے۔ دوسرے اس میں مغرب کے بارے میں انتہا پسندانہ موقف اپنایا گیا ہے۔

ضروری اقدامات

جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے کہ مدارس اس مسئلہ سے اپنے طلبہ کو کیسے واقف کرائیں تو اس کے لیے درج ذیل اقدامات کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ مولانا وحید الدین خاں کی منتخب کتب، مثلاً ''علم جدید کا چیلنج'' کا مطالعہ طلبہ کے لیے لازمی کر دیا جائے اور اس پر نمبرات دیے جائیں۔

۲۔ جدیدیت پر تعارفی لٹریچر کا مطالعہ کرایا جائے، خاص کر منتہی درجات کے طلبہ سے۔

۳۔ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر ماہرین سے مطالعے کرائے جائیں۔

۴۔ انگریزی میں یا اردو میں اس موضوع پر متعلقہ کتب کے مخصوص ابواب کا مطالعہ کرایا جائے، مثلاً چارلس ٹیلر کی کتاب ''The Secular Age'' کی بعض فصلوں کا مطالعہ۔

۵۔ اس موضوع پر مدرسہ ڈسکورسز کے بانیان اور اساتذہ کے صلاح و مشورہ سے مزید تعارفی لٹریچر تیار کرایا جا سکتا ہے۔ اس عمل کے لیے مدارس کے موجودہ درس نظامی (یا دوسرے نصابات) میں فرسودہ مضامین اور کتب کی غیر ضروری تکرار کو ختم کر کے نصابی بوجھ کم کر کے گنجایش پیدا کی جا سکتی ہے۔

یا بڑے مدارس، مثلاً دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلما، مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الفلاح اور جامعہ اشرفیہ و جامعہ سلفیہ وغیرہ میں الگ سے شعبے کھولے جا سکتے ہیں، جن میں یک سالہ کورس کے ذریعے سے افتاء، دورۂ حدیث اور تخصص و فضیلت کر چکے منتخب فضلا کو مغربی فکر اور انگریزی زبان، سائنس اور جدید فلسفہ سے متعارف

جاوید اکبر انصاری، عبدالوہاب سوری، خالد جامعی اور دین محمد جوہر خاص ہیں۔ انھوں نے جامعہ کراچی میں تفہیم مغرب کے عنوان سے کام کیا ہے (جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش) مگر اپروچ بہت جارحانہ اور انتہا پسندانہ محسوس ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں کا ایک لنک یہ ہے:

http://kurfku.blogspot.in/?m=0

کرایا جائے۔

بقول حسن عسکری ۱۹۳۰ء کے قریب مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمایا تھا کہ ''میری آنکھیں تو یہ دیکھ رہی ہیں کہ اب اسلام کی حفاظت کرنے والے یورپ سے اٹھیں گے''،[۱۵] لیکن علما و اہل مدارس نے ان کے قول پر کوئی توجہ نہیں کی۔ نہ یورپ کے نئے انقلاب کو جاننے کی کوشش کی اور نہ اس سے مقابلے کی تیاری کی۔ اسی طرح ''تجدید و احیاء دین'' میں مولانا مودودی نے بھی تحریک شہیدین کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کا ماتم کیا تھا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''انھوں نے سب کچھ کیا، مگر اتنا نہیں کیا کہ ایک وفد بھیج کر یہ پتا لگانے کی کوشش کرتے کہ اِس نئی تہذیب کی طاقت کا راز کیا ہے''۔[۱۶] لیکن بعد میں تحریک اسلامی نے بھی اِس ضروری کام پر کما حقہٗ توجہ نہیں دی۔

جس طرح مغرب میں اسلام اور اسلامی علوم کے مطالعہ و تحقیق کے لیے استشراق کو رواج دیا گیا، اُسی پیٹرن پر عالم اسلام میں مغرب کو سمجھنے اور اس کی فکر پر مطالعہ و تحقیق کے لیے استغراب (مطالعۂ غرب) کا سلسلہ قائم ہونا چاہیے تھا، جو افسوس کہ نہیں ہو سکا اور اب بھی مسلم دنیا میں ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے جہاں اس موضوع پر کام کیا جاتا ہو۔ ایسا ادارہ یا ایسے افراد تیار کرنا جو اسلام کے عالم ہونے کے ساتھ ہی مغربی فکر کے بھی ماہر ہوں، وقت کی اولین ضرورت ہے۔

۱۵۔ مجموعۂ حسن عسکری، ص ۱۱۷۲۔

۱۶۔ دیکھیے: مولانا مودودی، تجدید و احیاء دین: اسلامک پبلیکیشنز لاہور، مئی ۱۹۹۹ء، ص ۱۲۵-۱۲۸۔